تصنیف: ایما گولڈمان ۱۹۱۰ء

ترجمہ: محمد مظاہر

شادی اور محبت

عمومی تصور تو یہ پایا جاتا ہے جیسے نکاح اور محبت ہم معنی ہیں یا جیسے ان دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہو اور انسانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں۔ دیگر مقبول نظریات کی مانند یہ بھی درست حقائق پر نہیں ٹکا ہوا بلکہ اوہام پر قائم ہے۔

شادی اور محبت کے مابین کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ ان کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ قطب جنوبی اور شمالی میں بلکہ درحقیقت یہ ایک دوسرے سے بیر رکھتی ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ چند شادیاں محبت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ تاہم اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ محبت صرف شادی ہی کی گود میں توانا ہوتی ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ چند لوگ نہیں چاہتے کہ ان کا قد وقامت روایات کے تنگ جامے سے بڑھنے پائے۔ آجکل ان عورتوں اور مردوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جن کی نظر میں شادی نہ صرف یہ کہ ایک لایعنی شے ہے بلکہ ایک ڈھونگ ہے لیکن وہ محض عوامی دباؤ کی وجہ سے اطاعت کرتے ہیں۔ کچھ بھی کہیے، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ چند شادیاں محبت پر قائم ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ چند مثالوں میں شادی شدہ زندگی میں بھی محبت موجود رہتی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ شادی کے بغیر بھی قائم رہتی ہے یعنی شادی کے بندھن کے بغیر۔

جبکہ دوسری جانب یہ بالکل بکواس ہے کہ شادی سے محبت جنم لیتی ہے۔ آپ کے کان میں شاید ہی کسی ایسے معجزہ کی بھنک پڑے کہ ایک شادی شدہ جوڑا انکاح کے بعد عشق میں مبتلا ہوا ہو۔ لیکن گہری چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناگزیر انجام سے بچنے کے لیے حساب دوست و درون دل، کے ہے بجائے معاملہ بازی کے۔ دونوں کا یقیناً ایک دوسرے کا عادی ہوتے جانا کا، بے ساختگی سے کوئی دور پرے کا بھی واسطہ نہیں ہے، محبت کی گہرائی اور حسن جس کے بغیر شادی کی پیدا کی ہوئی شناسائی مرد اور عورت دونوں کے لیے ذلت سے کم ثابت نہ ہونا چاہیے۔

شادی اصولی طور پر ایک معاشی بندوبست ہے یا بیمے والا سمجھوتہ۔ یہ زندگی کے عام بیمے سے محض اس حد تک مختلف ہے کہ اس کی گرہ کہیں زیادہ سخت ہوتی ہے اور سخت گیر بھی۔ اس میں جو رقم لگائی جاتی ہے اس سے حاصل ہونے والا منافع نہایت قلیل ہوتا ہے۔ جب آپ بیمہ پالیسی خریدتے ہیں تو ڈالر اور سینٹ ادا کرتے ہیں جس میں یہ سہولت بھی ہوتی ہے کہ جب چاہیں قسطوں کی ادائیگی روک دیں۔ تاہم اس کے باوجود اگر عورت کا پریمیم خاوند کو سمجھا جائے تو اس کی ادائی وہ اپنے نام، تخلیے اپنی عزت نفس اور اپنی زندگی کی شکل میں مشہور مثل ''ڈولا جارہا ہے اب سسرال سے تمہاری میت نکلے'' پر بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ مزید براں شادی کا بیمہ عورت کو تاحیات انحصار کا شکار بنانے کے علاوہ اس کو طفیلی، بحیثیت فرد اور بطور معاشرے کے رکن کے قطعاً بے مصرف بنا دیتا ہے۔ مرد کو بھی بھاری چنگی ادا کرنا پڑتی ہے لیکن چونکہ اس کی سرگرمیوں کا میداں وسیع ہوتا ہے اس لیے شادی اسے اتنا نہیں بھینچتی جتنا عورت کو کرتی ہے۔ تاہم وہ غم روزگار کی زنجیروں میں الجھ جاتا ہے۔

یوں ڈانٹے کا برزخ پوری قوت سے شادی پر بھی صادق آتا ہے۔ ''وہ جو یہاں داخل ہوا اسے تمام امیدوں سے ہاتھ دھو لینا چاہیے'' شادی دیوالیہ ہو چکی ہے، احمق کے علاوہ کوئی بھی اس کی تردید نہ کرے گا۔ جو چاہے طلاقوں کے اعداد و شمار پر ایک سرسری نظر ڈال کر اندازہ لگا لے کہ فی الواقع شادی کس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس تاویل کو طوطے کی طرح رٹ لگانے والے، کہ طلاق کے قوانین میں نرمی اور خواتین میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اس کا جواز ہے، یعنی پہلی بات کہ ہر بارھویں شادی طلاق پر ختم ہو رہی ہے، دوم کہ 1870 سے ہر ایک لاکھ میں 28 مطلقہ افراد کی تعداد بڑھ کر 73 ہو چکی ہے۔ سوم شادی شدہ لوگوں میں غیروں سے جنسی تعلقات کی شرح 1867ء کے مقابلے میں 270% بڑھ کر وجہ طلاق بن چکی ہے اور چوتھا سبب فرار ہے جس میں 369.8 گنا اضافہ ہوا ہے۔

ان حیران کن اعداد و شمار کے علاوہ بہت سا مواد ڈراموں اور ادبی شکل میں بھی موجود ہے جو موضوع کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ رابرٹ ہیرک 'ٹوگیدر میں' پینیر و 'مڈ چینل میں' ایوجین والٹر آن پیڈ ان فل' اور انگنت مصنفین شادی میں باہمی مفاہمت اور ہم آہنگی کی نایابی کو ایک سبب قرار دیتے ہیں جس سے اس میں بنجر پن، یکسانیت اور تنگدلی پیدا ہوتی ہے۔

سماجیات کا سنجیدہ طالبعلم اس گتھی کو سلجھانے کی غرض سے اس مقبول مگر کاغذی جواز سے خود کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ وہ تو کھودتا ہوا دونوں صنفوں کی زندگی کی تہہ میں اتر جائے گا تاکہ یہ جان سکے کہ شادی اتنی تباہ کن کیوں ثابت ہوتی ہے۔ ایڈورڈ کارپینٹر کا تو یہ کہنا ہے کہ ہر شادی کے پس منظر میں دونوں صنفوں کا ازلی ماحول طاری

رہتا ہے۔اور یہ ایسی فضا ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی اتنی ضد ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ مرد اور عورت لازماً اجنبی بنے رہیں۔ان کو جدا رکھنے والی اوہام کی ایک ایسی دیوار ہوتی ہے جسے پھاندا نہیں جاسکتا، رسم ورواج اور عادات۔شادی کے ظرف میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ باہمی احترام کے فروغ کے لیے علم کو فروغ دے سکے جس کے بغیر ہر بندھن کا انجام صرف ناکامی ہوتا ہے۔

ہنرک ابسن جو تمام سماجی ریاکاریوں سے متنفر تھا، غالباً پہلا فرد تھا جس پر یہ عظیم صداقت منکشف ہوئی۔نورا اپنے شوہر کو چھوڑ کر چل دیتی ہے اس لیے نہیں جیسا کہ احمق نقاد سمجھے گا۔اس لیے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی سے تھک گئی ہے یا اسے حقوق نسواں کا احساس پیدا ہوگیا ہے جبکہ اصل صورتحال یہ ہے کہ اسے علم ہو چکا ہے کہ وہ گذشتہ آٹھ برس سے ایک اجنبی کے ساتھ رہ رہی ہے اور اس کے لیے بچے جن چکی ہے۔کیا کسی شے سے اس سے زیادہ ذلت یا مزید توہین ممکن ہے جس میں زندگی بھر کی قربت کے باوجود دونوں قطعاً اجنبی رہتے ہیں۔عورت کو مرد کے متعلق کچھ بھی جاننے کی ضرورت نہیں ہے الّا اس کی آمدنی کے۔اور عورت کو اپنی ذات کے متعلق کیا علم ہونا چاہیے۔یا اس میں جاننے کو کیا رکھا ہے کہ اس کے خدوخال آیا دلکش ہیں۔ہم ابھی تک مسیحی واہمے سے نہیں نکل پائے ہیں کہ عورت میں روح نہیں ہوتی اور یہ بھی کہ وہ مرد کا دم چھلہ ہے جس کی تخلیق مرد کی پسلی سے ہوئی ہے تاکہ اس ذات شریف کو ذرا سا چین میسر آجائے کیونکہ وہ اتنا تنومند وتوانا تھا کہ اپنے ہی سائے سے سہمنے لگتا۔

اتفاقاً عورت کا خمیر ایک خراب مٹی سے بنا ہے جو اس کی کمتری کا ذمہ دار ہے۔کچھ بھی کہیں، عورت میں روح نہیں ہوتی۔اس لیے اس کے متعلق کچھ جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ مزید براں، عورت میں روح میں جتنی کمی ہوگی، بطور زوجہ اتنی ہی زرخیز ہوگی اور اتنی ہی عجلت سے وہ اپنے خاوند میں جذب ہوسکے گی۔مرد کی بالادستی کے سامنے اسی غلامانہ 'راضی بہ رضا' ذہنیت نے شادی کے ادارے کو اتنے طویل عرصے تک بظاہر محفوظ رکھا ہے۔چونکہ اب عورت شعور ذات سے بہرہ مند ہو رہی ہے اور یوں اسے فی الواقع یہ گہرا احساس ہوتا جارہا ہے کہ مجازی خدا سے جدا بھی اس کی ایک ذات ہے۔اس لیے شادی کا مقدس ادارہ بتدریج کھوکھلا ہو رہا ہے اور چاہے جتنا جذباتی ماتم وگریہ وزاری کی جائے یہ ٹھہر نہیں سکتا۔

آنکھ کھولتے ہی تقریباً ہر اوسط درجے کی لڑکی کو یہ ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کے وجود کا واحد مقصد شادی ہے اس لیے اس کی تربیت اور تعلیم کا رخ اسی منزل کی طرف رہے۔جس طرح قربانی کے بیل کو کھلا پلا کر سانڈ بنایا جاتا ہے۔عورت کی بھی اسی طرح پرورش ہوتی ہے مگر حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ نیم ہنرمند دستکاروں کے برخلاف اسے اپنے مادری اور بیوی کے فرائض کے متعلق بہت کم جاننے دیا جاتا ہے۔کسی مہذب لڑکی کے لیے یہ بات غیر شائستہ اور گندی سمجھی جاتی ہے اگر وہ ازدواجی تعلقات کے متعلق کچھ جاننا چاہے۔ہائے کوئی شرافت کی ناہمواری تو دیکھے جو شادی کے بندھن سے قسمیہ عہد وپیمان لیتی ہے کہ وہ اسی گندگی اور غلاظت کو طاہر اور پاک کے علاوہ انتہائی مقدس اور پوتر بنادے جس کے متعلق نہ تو کوئی سوال پوچھنے کی جرات کرسکتا ہے نہ ہی سوال پوچھتا ہے۔اس کے باوجود شادی کے ہر اوسط درجے کے حامی کا یہی رویہ ہوتا ہے۔

بیوی بنائی جانے والی اور ماں بننے والی لڑکی کو اس مقابلے کی دنیا میں اپنے واحد قیمتی اثاثہ سے یکسر بے خبر رکھا جاتا ہے وہ ہے۔جنس کاری۔یوں وہ اس شخص کے ساتھ زندگی بھر کے رشتے میں داخل ہوتے ہی ایک نہایت فطری، صحتمند اور جبلّی جذبہ۔جنس کے تحت خود کو ایک صدمے، گھناونے پن اور ایسی برہمی میں پاتی ہے جسے بیان کرنا ممکن نہیں۔یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہماری ناخوشی، غم واندوہ رنج ومحن کے علاوہ جسمانی مار پیٹ جو شادی کے طفیل ہوتی ہے یہ سب اسی جنسی معاملات سے مجرمانہ بے خبری کا نتیجہ ہوتی ہے جس پر ایک عظیم نیکی کہہ کر مدح وثنا کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔اسے کوئی مبالغہ نہ سمجھا جائے جب میں یہ کہتی ہوں کہ لاتعداد گھر محض اس قابل مذمت امر کی وجہ سے برباد ہوئے ہیں۔

تاہم عورت اگر آزاد ہو چکی ہے اور اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ حکومت اور کلیسا کی اجازت کے بغیر جنس کی بھول بھلیاں کو سمجھے تو اس کی اتنی لعنت ملامت ہوگی کہ وہ کسی شریف آدمی کی بیوی بننے کے لائق نہ سمجھی جائے گی. مذکورہ شخص میں صرف دو اوصاف ہوتے ہیں یقینی خالی کھوپڑی ور بہت سا روپیہ۔اس خیال سے بڑھ کر کیا کوئی ذلت ہوسکتی ہے کہ ایک صحتمند اور بالغ عورت، جو زندگی اور شوق جنون سے لبریز ہو، فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرادے اور اپنی ذات کی سب سے توانا امنگ کو تھپک تھپک کر سلاتی رہے، اپنی صحت کو گھن لگادے اور روح کو کچل ڈالے، نظروں کو موٹی کرلے اور جنسی تجربے کی گہرائی اور تابندگی سے اس وقت تک پرہیز کرے یہاں تک کہ ایک ''شریف'' آدمی کہیں سے نمودار ہو اور اس کا ہاتھ تھام کر بطور بیوی اس کا بوجھ برداشت کرے؟ شادی کے بالکل ٹھیک ٹھیک یہی معنی ہیں۔یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان انتظامات کا انجام ناکامی نہ ہوگا؟ اگرچہ یہ کوئی کم اہم بات نہیں ہے مگر ایک ایسا امر ضرور ہے جو اسے محبت سے ممتاز کرتا ہے۔

ہمارا عہد ایک عملی دور ہے۔ وہ زمانہ جب رومیو اور جیولٹ نے محبت میں جان جوکھوں میں ڈالی اور اپنے باپوں کا قہر سہا۔ جب گیرتچن نے اپنے عشق کی خاطر پڑوسیوں کے طعن و تشنے برداشت کیے، وہ دن اب لد گئے۔ اب اگر کبھی کبھار نوعمر لوگ عشق و محبت کی عیاشی میں پڑتے ہیں تو ان کے بزرگ یہ ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں اور ان کی اس وقت تک خبر لیتے ہیں اور دھمکاتے رہتے ہیں جب تک وہ ''ہوش'' میں نہ آ جائیں۔

لڑکی میں یہ سبق کوٹ کوٹ کے نہیں بھرا جاتا کہ آیا خاوند نے اس کی محبت کے چراغ کی لو کو اونچا بھی کیا، اس کے بجائے یہ پوچھا جاتا ہے کہ ''مال کتنا ہے'' امریکہ کی عملی زندگی کا واحد دیوتا: کیا شوہر گھر کے اخراجات پورا کر سکتا ہے؟ یہی اکلوتی شئے ہے جو شادی کا جواز ہے۔ بتدریج یہی خیال لڑکی کے تمام نظریات پر غلبہ پالیتا ہے، وہ چاندنی راتوں اور بوس و کنار کے خواب نہیں دیکھتی، نہ ہی قہقہوں اور آنسو کے: وہ خریداری شاپنگ کے پھیروں اور مول تول کے کاؤنٹر کے خواب دیکھنے لگتی ہے۔ روح کا یہ افلاس اور تنگدلی ایسے عناصر ہیں جو شادی میں پوشیدہ ہیں۔ ریاست اور کلیسا اس کے علاوہ کسی اور ادارے کی محض اس لیے حمایت نہیں کرتے کیونکہ اسی کے ذریعے ریاست اور کلیسا کو مردوں اور عورتوں پر کلی اختیار حاصل ہوتا ہے۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو محبت کو ڈالر اور سینٹ سے بالاتر جانتے ہیں۔ بالخصوص اس طبقہ پر یہ بات صادق آتی ہے جنہیں معاشی ضرورتوں نے اس پر مجبور کیا ہے جو خود کفیل بنے ہیں۔ عورتوں کی حیثیت میں جو زبردست تبدیلی آئی ہے جو اسی طاقتور عنصر کا پیدا کردہ ہے اور رو بہ عروج ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ کتنے مختصر عرصے میں ہوا ہے جب عورت نے صنعتی میدان میں قدم رکھا تھا۔ ساٹھ لاکھ اجرت پر کام کرنے والی خواتین: انہی ساٹھ لاکھ خواتین کو مساوی حقوق حاصل ہیں کہ ان کا مردوں ہی کی طرح استحصال کیا جائے۔ انہیں لوٹا جائے ہڑتال کریں اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر فاقے بھی کریں۔ اور کہیں۔ کچھ اور میرے آقا؟ جی ہاں ساٹھ لاکھ اجرتی کارکن زندگی کے ہر شعبے میں، اعلیٰ ترین ذہنی کام سے لے کر کانوں اور ریل کی پٹریاں بچھانے کی جان لیوا جسمانی مشقت تک۔ یہاں تک کہ جاسوس اور پولیس والا کام بھی۔ آزادی نسواں اب شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

اس کے باوجود اجرتی کارکن خواتین کی موج در موج میں سے ایک محدود تعداد ایسی ہے جو روزگار کو جزو زندگی جانتی ہے یا بالکل اسی نظر سے دیکھتی ہیں جیسے مرد سمجھتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آخرالذکر کتنا خستہ حال ہے اسے یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ مختار اور خود کفیل رہے۔ ہائے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری اقتصادی چکی میں کوئی بھی درحقیقت خود مختار نہیں ہے۔ اس کے باوجود غریب سے غریب آدمی نما بھنگا اس سے متنفر ہوگا کہ کوئی اسے طفیلی سمجھے یا اس سے ملتا جلتا ہو، اس کے لیے وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔

عورت اپنی حیثیت کو عارضی کارکن سمجھتی ہے جسے پہلی بولی لگانے والے کی جھولی میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی لیے مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو منظم کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ ''میں کسی ٹریڈ یونین کی رکن کیوں بنوں؟ میری تو شادی ہونے والی ہے اور میں گھر بار والی ہو جاؤں گی۔'' کیا اسے بچپنے ہی سے اس معاملے کو اس طرح سمجھنے کی تربیت نہیں دی جاتی کہ اس کی معراج یہی ہوگی۔ اسے جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ گھر جو اگرچہ اتنا وسیع و عریض نہیں ہے جتنی فیکٹری ہے مگر اس کے دروازے اور سلاخیں کہیں زیادہ ٹھوس ہیں۔ اس کا ایسا پاسبان ہے جسے کوئی ذی روح چکمہ نہیں دے سکتی۔ تاہم المناک ترین حصہ یہ ہے کہ گھر اسے اجرتی کنیزی سے نجات دلانے کی بجائے صرف اس کے کام اور مشقت میں اضافہ کر دیتا ہے۔

ایک کمیٹی کے سامنے جو اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں ان کے مطابق ''محنت اور اجرتیں اور آبادی کا ہجوم'' نیویارک شہر میں اجرتی کارکنوں کی صرف دس فیصد آبادی شادی شدہ ہے اس کے باوجود دنیا بھر کے مقابلے میں انہیں حقیر ترین اجرتوں پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس بھیانک صورتحال کے بعد انہیں گھر پر چکی چولہے کی چاکری کرنا پڑتی ہے۔ آپ ہی بتائیے گھر کا تحفظ اور شان و شوکت کہاں گئی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ درمیانے طبقے کی شادی شدہ لڑکی اسے گھر نہیں کہہ سکتی کیونکہ یہ مرد ہے جو اس کے لیے مکان کو گھرانہ بناتا ہے۔ یہ اتنا اہم نہیں ہے کہ شوہر خونخوار ہے یا لٹو۔ میں تو یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ شادی عورت کو اس وقت گھر دیتی ہے جب شوہر کا رحم و کرم شامل حال ہو۔ شوہر کے دیے ہوئے اس گھر میں سال ہا سال تک اس وقت تک گھومتی پھرتی رہتی ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کے تمام گوشے اور انسانی رشتے پختہ فرش' اتنے تنگ اور بے کیف ہو جاتے ہیں جتنا کہ اس کے گھر کا ماحول اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے جو وہ ڈانٹ ڈپٹ میں مبتلا، تنگ دل لڑاکو، بکواسی اور ناقابلِ برداشت ہو کر خاوند کو گھر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر وہ چاہے بھی تو کہیں نہیں جا سکتی دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جہاں وہ جائے۔ شادی شدہ زندگی کے ایک مختصر دور کو چھوڑ کر اور اپنی کل صلاحیتوں سے دستبردار ہونے کے بعد ہر اوسط درجہ کی عورت باہر کی دنیا کے لیے قطعاً معذور ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھنے میں بے ڈھب، حرکات و سکنات میں بے ڈول، فیصلہ کرنے میں دوسری کی محتاج، قوت فیصلہ میں ہراساں، ایک بوجھ اور بیزار کن ذات جسے مردوں کی اکثریت بتدریج

حقارت سے دیکھنے لگتی یا نفرت کرنے لگتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کے واسطے یہ کس قدر ولولہ خیز ماحول تخلیق کیا گیا ہے کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

اب رہا بچہ، اسے کیونکر تحفظ ملے جس سے شادی کی حفاظت مقصود ہے۔ بہر حال زیر غور یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے؟ یہ منافقت اور محض دھوکے کی ٹٹی ہے کہ شادی بچوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے اس کے باوجود ہزاروں بچے لاوارث اور بے گھر نظر آتے ہیں۔ شادی بچے کی پناہ گاہ ہونے کے باوجود یتیم خانے اور اصلاح خانے اٹے ہوئے ہیں۔ معصوم بچوں کو بے رحمی اور تشدد سے بچانے والی انجمنیں والدین کی ''محبت'' سے بچانے کی غرض سے رات دن مصروف رہتی ہیں تاکہ انہیں ان سے بھی زیادہ پیار و محبت گیری، سوسائٹی کے تحت ملنے لگے۔ آہ اس تماشے کو کیا کہا جائے۔

ممکن ہے شادی میں یہ طاقت ہو کہ ''گھوڑا دریا تک لے آئے'' لیکن کیا کبھی یہ اسے پانی پلا سکی ہے؟ قانون تو باپ کو حراست میں لے لے گا اور اسے مجرموں کا لباس پہنا دے گا۔ کیا یوں بچے کی ہوک فرو ہوئی ہے؟ اگر باپ بے روزگار ہے اور یا وہ روپوش ہو جاتا ہے تو پھر شادی کیا کر لیتی ہے؟ وہ قانون کو دہائی دیتی ہے کہ مرد کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے اور اسے بند سلاخوں دار دروازے کے پیچھے محفوظ کر دیا جائے۔ تاہم اس کی محنت مشقت کی کمائی بجائے بچے کو ملنے کے ریاست کو ملنے لگتی ہے۔ بچے کے ذہن میں باپ کی دھاری دار کرتے میں شکستہ حال تصویر بسی رہتی ہے۔

جہاں تک عورت کے تحفظ کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد عورت شامت اعمال کی مکمل تصویر ہوتی ہے۔ آیا اسے واقعی کوئی تحفظ ملتا ہے بلکہ یہ پورا اصول ہی اتنا کراہت انگیز ہے اور زندگی کے لیے کتنا شرمناک اور ذلت آمیز ہے اور انسانی وقار کی اس میں اتنی تذلیل ہوتی جو یہ تقاضہ کرتا ہے کہ اس جونک دار ادارے کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔

پدرسری نظام کی دوسری اولاد سرمایہ داری ہے۔ یہ انسان کو اپنے پیدائشی حق سے محروم کر دیتا ہے۔ نشوونما کو ٹھٹھرا دیتا ہے، اس کے جسم میں زہر بھر دیتا ہے، جہالت کے بھنور میں ڈال دیتا ہے، مفلس اور محتاج بناتا ہے اس کے بعد خیراتی ادارے بناتا ہے جو انسان کی بچی کھچی عزت نفس پر پروان چڑھتے ہیں۔

شادی کا ادارہ عورت کو جونک بنا ڈالتا ہے جس کا انحصار دوسروں پر ہوتا ہے۔ جو اسے اپاہج بنا کر زندگی کی جدوجہد کے لیے بے کار بناتا ہے، اسکے سماجی احساسات کو مجہول کر دیتا ہے اور اس کے تخیل کو شل کر ڈالتا ہے، اس کے بعد از راہ کرم تحفظ کا خول چڑھا دیتا ہے جو در حقیقت ایک دام اور پھندہ ہے جو انسانی کردار پر عذاب سے کم نہیں۔

اگر نسوانی فطرت کا نقطہ کمال اس کی مادریت میں پنہاں ہے تو اسے محبت اور آزادی کے سوا کون سا تحفظ درکار ہے؟ جبکہ شادی تو صرف اس کی تکمیل ذات کو غلیظ، شرمناک اور بدعنوان بنا دیتی ہے۔ کیا یہ عورت کو حکم نہیں دیتی کہ جب تم میری اطاعت کرو گی تب تم زندگی کو جنم دے سکو گی؟ کیا یہ عورت کو گردن زدنی کی سزا نہیں دیتی، کیا یہ لڑکی پر تحقیر اور ذلت کا ٹوکرا اس وقت نہیں الٹ دیتی جب وہ اپنے حق مادریت کو شادی کے نام پر فروخت کرنے سے انکار کر دے؟ کیا یہ صرف شادی نہیں ہے جو حق مادریت کی منظوری فرماتی ہے یوں حمل ٹھہرنے میں تنفر اور مجبوری نہیں پنہاں ہوتی ہے۔ پھر بھی اگر مادریت پسند کی ہو جس میں محبت، وارفتگی اور نافرمانی کا جذبہ بھی شامل ہو تو کیا ایسے معصوم سر پر کانٹوں دار تاج نہیں رکھ دیا جاتا جس پر خونی حروف والا کلنک کا ٹیکہ نہیں جڑا ہوتا ہے یعنی ''حرامی''؟ کاش شادی میں وہ تمام خوبیاں موجود ہوتیں جن کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن مادریت کے خلاف اس کے تمام جرائم عالم عشق کی حدود سے اسے ہمیشہ کے لیے بے دخل کرنے کے لیے کافی ہیں۔

محبت جو زندگی میں طاقتور ترین اور عمیق ترین عنصر ہے اور جو امید، حسرت، سرشاری کی منادی ہے، عشق جو تمام قوانین کو موڑنے والا اور روایات شکن ہے، محبت جو مکمل آزادی ہے اور جو انسان کا نصیب سنوارنے کے واسطے سب سے زیادہ طاقتور اور پگھلانے والی قوت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی لازوال قوت اس پیاری سی غریب ریاست اور لاغر کلیسا کی دلاری تخلیق (شادی) اس کے ہم پلہ ہو جائے۔

بے باک محبت؟ کیا بغیر آزادی کے کوئی چیز محبت کہی جا سکتی ہے! انسان ذہن کو خرید سکا ہے لیکن دنیا میں کروڑوں نے محبت خریدنے میں منہ کی کھائی ہے۔ انسان جسموں کو اپنے آگے جھکا سکا ہے مگر دنیا بھر کی پوری طاقت بھی محبت کو زیر کرنے سے قاصر رہی ہے۔ آدمی نے پوری پوری قوموں کو فتح کر لیا لیکن اس کی تمام افواج قاہرہ محبت کو مغلوب نہ کر سکیں۔ انسان نے روح کو بیڑی پہنا دی اور اسے شکنجے میں کس لیا مگر وہ عشق کے سامنے قطعاً بے بس ہو گیا۔ تخت پر جلوہ گر ہو کر، اپنے تمام جاہ و جلال اور شان و شوکت کے باوصف اور سونے کے ڈھیر لگا لینے کے بعد آدمی پھر بھی غریب اور تنہا رہتا ہے اگر محبت اس سے کترا کر نکل جائے اور اگر یہ ٹک جائے تو مفلس کی جھونپڑی بھی اس کی گرمی اور توانائی سے منور ہو جاتی ہے جس میں زندگی اور جلترنگ بجنے لگتے ہیں۔ محبت میں ایک ایسی طلسمی طاقت ہوتی ہے جو ایک فقیر کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔ ہاں، محبت آزادی کا دوسرا نام ہے یہ کسی اور ماحول میں پنپ نہیں سکتی۔ اگر آزادی میسر ہو تو یہ بے باکی سے خود کو سپرد کرتی ہے، بے حدو

حساب اور پوری طرح۔ کتابوں میں درج تمام قوانین کی حقیقت کیا ہے اگر یہ ایک مرتبہ جڑ پکڑ لے تو کائنات کی کل عدالتیں بھی اسے دنیا سے نہیں اکھاڑ سکتیں۔ تاہم زمین اگر بنجر ہو تو شادی اس سے بارآور فصل کیسے حاصل کر سکتی ہے۔ محبت تو چند روزہ زندگی کا جان پر کھیل کر موت کو شکست دینے کا آخری ہتھیار ہے۔

محبت کو کسی تحفظ کی ضرورت نہیں یہ خود ہی اپنی محافظ ہے۔ جب محبت زندگی کو پروان چڑھاتی ہے تو کوئی بچہ لاوارث یا بھوکا نہیں رہتا اور نہ ہی شفقت کی کمی سے فاقہ زدہ رہے گا یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو اپنے محبوب مردوں سے آزادانہ تعلق کی وجہ سے مائیں بنیں۔ شادی شدہ جوڑوں کے چند ہی ایسے خوش نصیب بچے ہوں گے جنہیں اتنی نگہداشت اور تحفظ میسر آیا ہو جس فراوانی کی آزاد مادریت متحمل ہو سکتی ہے۔

اقتدار کی پشت پناہی کرنے والے آزادانہ مادریت کے ظہور سے لرزہ بداندام ہیں کہ کہیں شکار ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ پھر جنگیں کون لڑے گا؟ دولت آفرینی کون کرے گا؟ پولیس میں کون بھرتی ہوگا، جیلر کس کو بنائیں گے اگر عورتیں برے بھلے کی تمیز کئے بغیر بچے جننا چھوڑ دیں گی؟ نسل، ہماری نسل! بادشاہ، صدر، سرمایہ دار، پادری، ملا اور پنڈت چیخ و پکار سے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ نسل ہر حال میں بچنا چاہیے چاہے عورت کل بن کر محض ایک مشین رہ جائے اور شادی کا ادارہ عورت میں ضرر رساں بیداری جنس کے تصورات کے خلاف ہمارا آخری حفاظتی صمامہ یا والو ہے۔ کنیزی اور غلامی کو جوں کا توں رکھنے کی تمام بدحواسی والی مساعی فضول ہیں۔ بے کار ہیں کلیسا کے فرامین بھی، حکمرانوں کے دیوانہ وار حملے بھی اور قانون کے ہاتھ بھی بے دست و پا ہیں۔ عورت اب یہ نہیں چاہتی کہ وہ ایک مریض، نحیف، خستہ حال اور بدنصیب نوع بشر کی تخلیق میں ہاتھ بٹائے جس میں نہ تو اتنی طاقت ہے اور نہ ہی اخلاقی جرات کہ مفلسی اور غلامی کا جوا اتار پھینکے۔ اس کے بجائے وہ محدود تعداد میں اور بہتر بچے چاہتی ہے جنہیں اپنی مرضی سے بغیر کسی مجبوری کے جیسا کہ شادی کے بندھن میں ہوتا ہے تخلیق کرے اور محبت کے سائے میں پروان چڑھائے۔ ہمارے نام نہاد اخلاقیات کے علمبردار کو ابھی بچے سے متعلق گہرے احساس ذمہ داری کا علم حاصل کرنا باقی ہے، محبت کرنے کی آزادی جتنا عورت کے کلیجے میں پیدا کر چکی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس حیات کو ایسے ماحول میں لانے سے دستکش ہو جائے جس کی دھونکنی سے موت اور تباہی نکلتی ہے عین ممکن ہے وہ ہمیشہ کے لیے مادریت کے مایہ ناز مقام ہی سے دستبردار ہو جائے۔ اگر اسے ماں بننا ہی پڑا تو وہ بچے پر جان چھڑک کر اپنا ست پلا دے گی۔ بچے کے ساتھ بڑھنا اس کے لیے اول و آخر ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے حقیقی مردانگی اور نسوانیت کی تکمیل ممکن ہے۔

ہو نہ ہو ابسن کے ذہن میں آزاد ماں کے خدوخال تھے جب ہی اس نے اشہب قلم سے مسز آل ونگ کو تخلیق کیا جو ایک مثالی ماں تھی جس کے جسم پر شادی کا آسیبی تنگ جامہ نہ چڑھ سکا کیونکہ وہ تمام زنجیروں کو توڑ چکی تھی اور خود کو اتنا آزاد کرتی گئی یہاں تک کہ ایسی ذات ابھری جو نئی جون میں نہایت توانا تھی۔ ہائے افسوس اتنی دیر ہو چکی تھی کہ اس کے لیے زندگی کے لطف کی بازیابی ممکن نہ تھی یعنی محبوب آوسولڈ۔ مگر اتنی تاخیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ احساس ہی جاتا رہے کہ ایک خوبصورت زندگی کی اولین شرط آزادانہ محبت ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے جنہوں نے مسز آل ونگ کی طرح اپنی روحانی بیداری کی قیمت خون اور آنسوؤں میں ادا کی ہے وہ شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے پیر تسمہ پا، چھچھلی اور کھوکھلی ہنسی سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ محبت چاہے پل بھر کی ہو یا دائمی یہ نہ صرف تخلیقی بلکہ ولولہ انگیز اور نئی نسل کے لیے باعث رفعت ہے۔

یہ ہماری بونی ریاست اور حکومت میں شامل زیادہ تر لوگوں کے لیے بلاشبہ ایک اجنبی شے ہے جسے غلط سمجھا جاتا ہے اور چھوت چھات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ جڑ نہیں پکڑ پاتی اور اگر پنپنے لگتی ہے تو جلد ہی کملا کر مر جاتی ہے۔ اس کا نازک ریشہ زندگی کے روزمرہ دباؤ اور کشاکش کی چکی کی مشقت کو نہیں جھیل سکتا۔ اس کی روح اتنی نازک اور پیچیدہ ہے کہ یہ ہماری مہین ململ جیسے سماجی تانے بانے میں نہیں سما سکتی۔ یہ ان کے ساتھ مل کر روتی ہے آہیں بھرتی ہے اور مصائب برداشت کرتی ہے جنہیں اس کی ضرورت ہوتی ہے اس کے باوجود ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ محبت کے بام عروج تک پہنچ سکیں۔

کسی روز شاید کوئی دن آتا ہے جب مرد اور عورتیں اٹھ کھڑے ہوں گے اور ہمالیہ کی چوٹی چھو لیں گے جب وہ وہاں پہنچیں گے تو وہ گرانڈیل توانا اور آزاد ہوں گے۔ وہ قبول کریں گے، ساجھے داری کریں گے اور محبت کی سنہری کرنوں میں تاپیں گے۔ کیا زور تخیل یا حاشیہ خیال یا پھر نابغہ روزگار شاعر اپنے آئینہ گفتار میں اس دور کی دھندلی سی بھی تصویر دیکھ سکتا ہے جب مردوں اور عورتوں کی زندگی میں اتنی قوت پیدا ہو جائے گی۔ اگر دنیا کبھی بھی ایسی سچی رفاقت اور ایکے کو جنم دے سکے، جس سے مراد شادی نہیں بلکہ محبت ہے جو والدین کی جگہ لے لے گی۔ شکریہ